ڈاکٹر محمد رحمان

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو ،ہزارہ یونیورسٹی ، مانسہرہ

رشید احمد صدیقی کے تنقیدی رجحانات

Dr Muhammad Rehman

Assistant Professor, Department of urdu, Hazara University , Mansehra

Critical Trends of Rasheed Ahmed Siddiqui

Rasheed Ahmed Siddiqui is basically known as humorist but he has also contributed to Urdu literature as a sketch writer and a critic. He has got impressionistic approach while analyzing the literary works of different Urdu writers. In this article, the author has discussed the critical trends of Rasheed Ahmed Siddiqui in the light of his critical works.

اردو ادب میں باقاعدہ تنقید کی ابتداء مولانا حالی کی لافانی کتاب ''مقدمہ شعروشاعری'' سے ہوتی ہے۔انہوں نے تنقید کو نیا ذہن اور نیا افق دیا۔ان کی عربی اور فارسی اصول انتقادیات پر گہری نظر تھی۔حالی کے ساتھ ساتھ اردو تنقید کا ایک معتبر نام مولانا شبلی کا ہے۔حالی اور شبلی کے ساتھ ہی اردو تنقید میں مغربی اثرات در آئے۔بیسویں صدی کی ابتدا میں اردو تنقید مغربی اثرات سے گراں بار ہو رہی تھی۔تاریخی اور تحقیقی تنقید میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق اور سلیمان ندوی، رومانوی تنقید میں چکبست اور عظمت اللہ خان، تقابلی تنقید میں ڈاکٹر بجنوری اور تاثراتی تنقید میں مہدی آفادی، فراق گورکھپوری اور نیاز فتح پوری اپنے اپنے حصّے کا کردار ادا کرنے میں مصروف تھے۔تاثراتی تنقید میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ ادب محض تاثر ہے اور اس کی تنقید صرف تاثرات کا مجموعہ ہونی چاہئے جو ادب کے مطالعے سے پیدا ہوتی ہیں۔تاثراتی نقاد نہ تو ان حالات کو پیش نظر رکھتے ہیں جو ادب کی تخلیق کا باعث ہوتے ہیں نہ ان نتائج سے بحث کرتے ہیں جو ادبی تخلیق سے پیدا ہوتے ہیں۔وہ ادبی تخلیق کو اس سماجی ماحول میں دیکھنے اور پرکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے۔ایسی تنقید میں نہ کسی فلسفہ کو دخل ہوتا ہے اور نہ ہی یہ سائنسی ہوتی ہے۔مغرب میں تاثراتی تنقید کے ابتدائی نقوش آسکر وائلڈ اور کروچے کے ہاں ملتے ہیں۔مغربی ادب میں رومانیت کے ساتھ ساتھ یہ تنقید پروان چڑھی۔اردو میں بھی یہ تنقید ان لوگوں کے ہاں ملتی ہے جو رومانیت سے متاثر ہیں۔نیاز فتح پوری کے بعد فراق گورکھپوری اور رشید احمد صدیقی کے نام تاثراتی نقادوں میں اہم ہیں۔(۱)

رشید احمد صدیقی کی بنیادی حیثیت مزاح نگار کی ہے۔طنز، نکتہ سنجی اور قول محال کا استعمال مزاحیہ نقوش کی تشکیل وتعمیر میں ان کے بڑے مہذّب اور موثّر حربے ہیں۔وہ بلاشبہ ادب کے باذوق قاری ہیں۔انہوں نے ادبی تنقید کو بھی اپنی توجہ

کا مرکز بنایا ہے۔انہوں نے جب تنقید کے میدان میں قدم رکھا تو یہ میدان خاصا وسیع ہو چکا تھا۔اردو تنقید کئی راہوں پر گامزن تھی۔رشید صدیقی کی اس حیثیت پر بات کرنے کے سے قبل تین باتوں کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے؛

۱۔ ایک تو یہ کہ انہیں فارسی ادب سے خصوصی تعلق رہا ہے اس لیے ان کی ذہنی تربیت اور افتادِ مزاج میں فارسی ادب کی روایات کو بڑا دخل ہے۔

۲۔ دوسرا یہ کہ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا کہ وہ تاثراتی مکتبِ فکر سے زیادہ اہم آہنگی محسوس کرتے ہیں

۳۔ تیسرا یہ کہ ان کا زیادہ تر زور تہذیبی اور ثقافتی اقدار پر ہے۔

رشید صاحب کی تنقیدی بصیرت کے اوّلین نقوش ''طنزیات و مضحکات'' میں ملتے ہیں۔اس مقالے میں طنز و مزاح کے فن کا تاریخی جائزہ لیا گیا ہے۔چونکہ انہوں نے خود اس فن کو تخلیقی طور پر برتا ہے اس لیے وہ جائز طور پر دوسروں کے مقابلے میں اس فن کے نشیب و فراز سے زیادہ واقف ہیں۔اس سلسلے کی دوسری کڑی ''مقدمہ باقیاتِ فانی'' ہے۔جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تمام تر مشرقی روایات کو پرکھنے کے حامی ہیں۔(۲) اس مقدمے کے دو حصّے ہیں۔پہلے حصّہ میں شعر و شاعری کی ماہیت اور شاعر کے منصب اور اس کی شریعت پر اظہار خیال کیا گیا ہے اور دوسرے حصّے میں کلامِ فانی کی خوبیوں پر مفصّل بحث کرتے ہوئے ہوئے اس کا موازنہ غالب سے کرتے ہیں۔مثلاً پہلے حصّے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو؛

> شاعر کی زبان سے عالم بے خودی میں ایک ترانہ نکل جاتا ہے جو سامعہ سے دماغ تک پہنچ کو وارفتہ ہستی کر دیتا ہے اور تھوڑی دیر کے لئے ہم اپنے دامنِ خیال سے کثافت عنصری کا غبار جھاڑ کر اس خاکدان آب و گل کی نا سوتی پستی سے بلند ہو جاتے ،اور اُس عالم میں جا پہنچتے ہیں جہاں محسوس ہونے لگتا ہے کہ گویا خدا اور اس کی ساری کائنات اور ہم خود صرف ایک دل کش ترانے اور ایک لطیف حقیقت میں گم ہو گئے ہیں۔(۳)

اس بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ رشید صاحب عینیت پسندی کا شکار ہیں جو آج کل زیادہ معتبر نہیں سمجھی جاتی۔وجہ یہ ہے کہ یہاں خیالی آرائیاں زیادہ ہیں جو نفسِ شاعری کی قابل اطمینان تفہیم نہیں کرتیں۔پورا بیان خاصا مبہم ہے جو کسی طرح ہماری رہنمائی نہیں کرتا۔موجودہ زمانے کا قاری ان تعمیمات کے مقابلے میں زیادہ واضح اور قابل اثبات نظریات کو قبول کرتا ہے۔تقابلی مطالعے کا جو انداز ''باقیاتِ فانی'' کے دوسرے حصّے میں اختیار کیا گیا ہے وہ البتہ غالبؔ اور فانیؔ کے ذہنی عمل کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

رشید صدیقی نے اپنے باقاعدہ نقاد ہونے کا کبھی دعویٰ نہیں کیا۔(۴) ان کے ہاں تنقید انسان کا فن ہے اور انسان کے بہترین کارناموں کو پرکھنے کا فن ہے۔ان کا اصل میدان طنز و مزاح کا ہے جو انہیں دوسروں سے ممتاز کرتا ہے۔جن سے اردو ادب کی آبرو قائم ہے اور خود طنز و مزاح کی بھی۔اس سلسلے میں سجاد ظہیر کی یہ رائے زیادہ اہم ہے؛

> ان کے مزاح کی بے ساختہ مزاجیت اور قدامت پسندی انہیں ایک دل چسپ مزاح نگار بنائے تو بنائے ا دب کی کسی بھی صنف کا پرمغز نقاد بننے نہیں دیتی۔(۵)

وجہ یہ ہے کہ وہ کسی کتاب کو اوّل تا آخر نہیں پڑھتے اور ادھر اُدھر سے پڑھ کر ایک رائے قائم کر لیتے ہیں۔اگر کسی کتاب کو باضابطہ پڑھنے کا سوال پیدا ہوتا ہے تو انہوں نے معذرت ظاہر کر دی ہے۔ڈاکٹر محمد حسن کے نام مکتوب میں لکھتے ہیں؛

ایک بیگار کر دیجئے۔ ''متاع تسکین'' بھیجتا ہوں۔ مصنف کا اصرار ہے کہ اس پر ''فکر و نظر'' میں تبصرہ کر دیا جائے۔ کچھ ایسی بات ہے کہ نہ انکار کر سکتا ہوں۔ اگر ایک صفحہ کا ریویو آپ اپنے نام سے لکھ دیں تو کام چل جاتا۔ یہ کام چند گھنٹوں کا ہے لیکن مجھ سے ہونے کا نہیں۔ (۵)

رشید صدیقی نے زیادہ تر تنقیدیں بوقتِ ضرورت لکھیں یا بوقتِ فرمائش۔ (۶) وہ نہ صرف ادب کے ایک معلم اور ایک برگزیدہ نثر نگار تھے بلکہ ان کو زندگی ہی میں اردو زبان اور تہذیب ایک علامت کے طور پر دیکھا جانے لگا تھا۔ اس قسم کی شخصیت کے کارناموں کو فرداً فرداً پرکھنے اور ان کی قدر و قیمت متعین کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ زیرِ مطالعہ شخصیت کو ایک کل کے طور پر سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ کچھ تعجب نہیں کہ تفہیم کے اس عمل سے ان گوشوں اور پہلوؤں کی بھی صحیح شکل سامنے آ سکے جو نسبتاً کمزور ہونے کے باعث ایک حد تک ناقابلِ توجہ ہیں۔

ادب سے گہرا شعف رکھنے کے باوجود رشید صاحب ادب کو زندگی کی کلّیت کا ایک جزو مانتے تھے اور اس حق میں نہیں تھے کہ جزو کو کل سمجھا جائے یا جزو کل پر حاوی ہو جائے۔ گویا زندگی ادب اور فن سے عظیم تر ہے۔ اس رویّہ سے فن برائے فن کی نفی خود بخود ہو جاتی ہے اور ایک پامال تنقیدی محاورہ کے مطابق فن برائے زندگی کا اثبات ہوتا ہے۔ اپنے مشہور خطبے ''عزیزان ندوہ کے نام'' میں ایک جگہ یوں رقم طراز ہیں:

''حسن صرف اس وقت تک حسن ہے جب تک وہ اخلاق و انسانیت کی چاکری میں ہے۔۔۔ شاعری برائے شاعری اسی طرح فعلِ عبث ہے جس طرح شاعری برائے مقاصد مشتبہ۔'' (۷)

شاعری کے مقاصد کو مشتبہ قرار دینے کے باوجود رشید صاحب فن سے مقصد کے اخراج کے حامی نہیں۔ البتہ یہ شرط ضرور عائد کرتے ہیں کہ مقصد خود ان کے قائم کیے ہوئے معیار کے مطابق پسندیدہ اور مستحسن ہو۔ فن مین مقصد کی کارفرمائی پر زور دینے والے تمام افراد اور حلقوں میں یہ ضد پائی جاتی ہے کہ فن گران کے مخصوص کے علاوہ کسی اور مقصد کا عکاس ہو تو فن اور مقصد دونوں مذموم۔ بہرحال رشید صاحب شاعری کو وسیلہ مانتے ہیں۔ وہ کسی کو یہ آزادی دینے کے لیے تیار نہیں کہ اس وسیلہ کو جس طرح چاہے برتے۔ فن کے ذریعہ اقدارِ عالیہ کی تفسیر اور تفسیر کے حوالہ کی وضاحت وہ یوں کرتے ہیں؛

میرے نزدیک اعلیٰ انسانی قدریں وہ ہیں جو زندگی اور کائنات کے بامراد اور برگزیدہ ہونے پر دلالت کرتی ہوں۔ (۸)

فانی کے ذکر میں ایک جگہ لکھتے ہیں؛

زندگی اور فن دونوں کا جواز امید میں ملتا ہے الم میں نہیں۔ (۹)

یہ طرزِ فکر اپنی نوعیت کے اعتبار سے منہائی (Reductive) ہے۔ بظاہر تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فن اور زندگی کے مضبوط رشتہ کو نظر میں رکھ کر فن کو زندگی کے تئیں جواب دہ قرار دیا گیا ہے۔ اس طرح زندگی کی کلیت فن کے دائرے میں داخل ہو گئی ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ یہاں دراصل زندگی کی ٹھوس حقیقت کی جگہ زندگی کی ایک تجرید کو فنی اظہار کا مقصود قرار دیا جا رہا ہے اور یہ تجربہ چند اصولوں سے عبارت ہے۔ اس نکتہ کو ذہن نشین کرتے ہوئے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ رشید صاحب اپنے وقت کے افشار اور ابتری کی ترجمانی اور تلخ کلامی کو کیوں ادنیٰ شاعروں کا کام سمجھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ اعلیٰ شاعر زمانہ پر

حاوی ہوجاتے ہیں۔اسی رویّہ کے باعث وہ سعادت حسن منٹو سے بدظن رہے اور شاید اکبر اور اقبال (جن کے وہ بڑے مدّاح تھے) سے بھی شاکی ہوتے اگر ان شاعروں کے یہاں آئیڈیلزم نہ ہوتا۔(۱۰) ان کے فن میں معیارِ تصوّر تجریدی ہے۔وہ شعر وادب کا سرچشمہ مذہب اور اخلاق کو مانتے ہیں اور اسی بنا پر مشرق اور مغرب کے ادب میں اخلاق کے پس منظر میں زندگی کے بامراد اور برگزیدہ ہونے، نیز امید کی فتح یابی کا تصوّر رشید صدیقی کے ہاں قائم ہوتا ہے۔ان کی ذہنی اور جذباتی کائنات میں ادب کا رشتہ اور زندگی کا رشتہ مذہب سے ناقابلِ شکست ہے۔ان کے رویے کو سمجھنے کے لیے پہلے زندگی کی طرف اور اس سے پہلے مذہب کی طرف ان کے رویے کو سمجھنا ہوگا بلکہ ان تینوں رویوں کو ایک اکائی کی صورت میں دیکھنا ہوگا۔اس ضمن میں ہمارا کام افہام وتفہیم ہے، تعین قدر نہیں۔

رشید صدیقی مذہب، زندگی یا ادب کسی میدان میں بھی کوئی باقاعدہ مفکر یا نظریہ ساز نہیں تھے لیکن ان تینوں شعبہ ہائے فکر وعمل سے ایک سنجیدہ اور مستقل ربط رکھتے تھے۔اپنی شوخیِ طبع کو شاید ہی انہوں نے کبھی یہ اجازت دی ہو کہ اس ربط کے بنیادی کردار پر اثر انداز ہو۔ان کے محسوس کرنے، سمجھنے اور سوچنے کے اسالیب میں ایک طرح کا تسلسل اور سلامت روی (ممکن ہے اسے ذہنی جمود سے تعبیر کیا جائے) پائی جاتی ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ مذہب، زندگی اور ادب کے بارے میں وہ چند تعینات کے قائل تھے اور اس پر پختہ یقین رکھتے تھے۔وہ شک وشبہ کی منزلوں سے کبھی نہیں گزرے لیکن بحیثیت مجموعی ان کے یہاں یقین کا رنگ غالب تھا اور اہلِ نظر کی طرف ان کا جو بھی رویہ رہا ہو وہ خدا، اس کی کتاب اور اس کے رسول کو ناقابلِ تردید حقیقت مانتے تھے۔زندگی کے ساتھ ان کے معاملہ کی اساس یہی عقیدہ تھا اور اسی عقیدے نے ان کے فکر اور احساس کو ایک سانچا مہیّا کیا۔تناسب کا غیر معمولی احساس (یہی احساس طنز ومزاح کی بنیاد ہے) رکھنے کی وجہ سے توازن، اعتدال، میانہ روی اور اپنے عقائد میں محکم ہونے کے باوجود وہ غلو اور اغراق سے گریزاں رہے۔افتادِ طبع کے اعتبار سے خدا اور بندے کے رشتہ کے تجریدی پہلو پر ان کی توجہ کم رہی۔انہوں نے آدمی کی زندگی کے ہر عمل کا معیار یہ مانا کہ وہ عبادت کے درجہ کو پہنچ جائے اور ایک انسانی عمل کی حیثیت سے ادب کو بھی اسی روشنی میں دیکھا۔جو معیار رشید صدیقی کے پیش نظر تھا اس کی کسوٹی انہوں نے اخلاق کو قرار دیا۔ان کی ادبی اقدار دراصل ان کی اخلاقی اقدار ہی کا عکس ہیں۔جب وہ ادب اور تنقید کو ایک اجتماعی ذمہ داری قرار دیتے ہیں تو ان کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ زندگی جو انعام الٰہی ہے بجائے خود ایک ذمہ داری ہے اور ادب وتنقید زندگی کے عمل کا ایک جزو ہیں۔لہٰذا ان کے آزاد اور خود مختار ہونے کا سوال ہی نہیں۔لکھنے کو تو رشید صاحب نے یہ لکھا ہے کہ ''شاعر، ادیب یا آرٹسٹ نہ زمانے کے پابند ہوتے ہیں نہ زندگی کے، نہ نقاد'' مگر یہ صرف اندازِ بیان ہے اور اس امر کی ترغیب کہ اقدارِ عالیہ کی خدمت کے لیے ضروری ہے کہ فنکار زندگی، زمانے اور تنقید کے ابتذال سے بلند ہو۔اس جملہ سے ان کی فکر کا کوئی تضاد ظاہر نہیں ہوتا اور نہ ہی فن اور فن کار کی غیر مشروط آزادی کا اعلان ہوتا ہے۔(۱۱)

زندگی کو انعام الٰہی مان کر ایک ذمہ داری کے طور پر قبول کر لینے کی صورت میں ایک منظّم اور مستحکم معاشرے میں یقین کا جواز پیدا ہو جاتا ہے۔ان کے ہاں اس قسم کے معاشرے کی ضرورت اور اہمیت کا احساس شعر وادب کی طرف ان کے رویہ کے تعین میں بڑی حد تک فیصلہ کن ثابت ہوا۔جس معاشرے کی تصویر ان کے ذہن میں تھی وہ مثالی ہونے کے باوجود ایسا تھا کہ وہ عملی شکل میں اس کے قیام کی آرزو کو اپنا رہنما بنا سکتے تھے۔اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ ڈسپلن کو زندگی (ادب اور فن) کی ایک بنیادی

قدر کے طور پر قبول نہ کرتے ۔ان کے سماجی اور ادبی دونوں قسم کی تنقید میں حفظ مراتب پر خاصا زور دیا گیا ہے ۔وجہ یہ ہے کہ ا یک قسم کی عمومی مساوات پر یقین رکھتے ہوئے بھی رشید صاحب معاشرے کے افراد کو ان کے فطری رجحانات کے تحت مختلف کاموں کا اہل سمجھ کر طبقات میں تقسیم کرنے کے قائل تھے۔

رشید صاحب کا خیال ہے کہ شعر وادب سے متعلق افراد اپنی ذمہ داریوں (معاشرے کا اخلاقی اور روحانی ارتفاع) کے پیشِ نظر اشراف سے تعلق رکھتے ہیں ۔ان کا شمار سماجی رہنماؤں میں ہوتا ہے۔ان کے مطابق اعلیٰ فنکار بڑے آدمی کا رول ادا کرتا ہے فن ہو یا زندگی منتخب افراد ہی کا ذوق وذہن کے مرکب پر سوار ہو کر آگے بڑھتی ہیں۔فن کار کے منصب کا یہ تصوّر نیا نہیں ہے اور ادب اور فن کی مثالی اور رومانی تصوّرات کی تاریخ میں اسے آسانی سے تلاش کیا جا سکتا ہے ۔اس نظریہ سے رشید صدیقی کی دل چسپی اگر صرف علمی نوعیت کی ہوتی تو شاید یہاں اس کا تفصیلی بیان کیا جاتا لیکن یہ نظریہ ان کے یہاں معاشرتی عقائد کے جزو کے طور پر ملتا ہے اور ان کے ادبی رویوں کو سمجھنے کے لیے ایک قسم کا پس منظر فراہم کرتا ہے۔رشید صدیقی ادبی تخلیقات کو انفرادی کارنامہ مانتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ فرد کی اہمیت سے انکار کرنا جہالت بھی ہے اور کفر بھی ۔مگر یہ فرد جب اپنے معاشرے سے کٹ جائے تو ان کے نزدیک لائقِ اعتنا نہیں ۔اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ فن سماجی انسان کی تخلیق کرتا ہے اور سماج کے لیے ہے۔البتہ یہ فرق ملحوظ رکھنا پڑے گا کہ ایک منتخب اور ذمہ دار فرد کی حیثیت سے فنکار کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ یہ فیصلہ کرے کہ ایک فنی اور جمالیاتی تجربہ کی شکل میں اسے اپنے ہم نفسوں کو کیا دینا چاہئے ۔اس معاملہ میں وہ سامعین اور نقاد کی پسند ناپسند سے آزاد ہے مگر ترسیل کی ذمہ داری سے اسے نجات نہیں۔جو فن اپنی ترسیل نہیں کر سکتا وہ منطقی اعتبار سے رشید صاحب کے نظام ادب وفن سے باہر ہے ۔اس لیے وہ ابہام کو ناپسندیدہ قرار دیتے ہیں ۔ان کا خیال ہے کہ شاعر اور اس کے مخاطب کے درمیان ناقابلِ عبور فاصلہ نہیں ہو سکتا اور شاعر اگر اپنے سامعین کو اپنی سطح تک نہیں لا سکتا تو اس نے اپنا فرض پورا نہیں کیا ۔اسی فرض کی اہمیت اور ہمہ گیری کا احساس ہر چیز کو رشید احمد صدیقی کی نظر میں مشتبہ بنا دیتا ہے جو شاعر کی توجہ اس مشق سے ہٹا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ زبان اور روزمرہ کے لوازم کو ہلکے موضوع اور شاعری کی ایک نچلی سطح کا خاصہ قرار دیتے ہیں ۔(۱۲) ویسے تو انہوں نے کہا ہے کہ ہیئت اور موضوع شاعری نہیں ہیں اور اس خیال کی تائید کی ہے کہ فن شعر میں معیار موضوعات سے زیادہ اہم ہے بلکہ ان کا خیال ہے کہ کوئی شاعر اس کا مجاز نہیں کہ خدا کی بھی ثنا وصفت ناقص شاعری میں کرے ۔لیکن ان تمام باتوں سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ وہ فن کی کفالت کے قائل تھے ۔فن کا افادی پہلو ہمیشہ ان کے پیشِ نظر رہا۔ وہ وجدان کے منکر نہیں تھے لیکن ساتھ ہی شعر گوئی کو ایک باشعوری عمل کے طور پر دیکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ شاعر ہر حال میں اپنی اخلاقی اور ثقافتی ذمہ داری سے باخبر رہے ۔اگر اس ذمہ داری کا تقاضا ہو تو اپنی ادبی روایت کو بھی مسترد کرے۔ وہ شاعر کے لیے نمونہ صحیفہ فطرت کو مانتے ہیں شعراء کے دواوین کو نہیں ۔وہ ادب اور تنقید کی طرف ایک اخلاقی یا مواعظانہ روش رکھتے ہیں جنہیں بادی النظر میں قبول کرنے کے لیے کوئی تیار نہیں ہوگا۔انہیں اس بات کا یقین ہے کہ کوئی نامعقول شخص اچھا شاعر نہیں ہو سکتا۔ ہمارے ادب میں فراقؔ اور جوشؔ اس اصول کی زندہ مثالیں ہیں۔اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاعر کا سفلی تعین تو روزمرہ زندگی کے معمولات میں منعکس ہوتا ہے لیکن اس کے مظہر اور اعلیٰ وارفع نفس کا پرتو ہمیں ان کی شاعری میں ملتا ہے ۔ بہ الفاظِ دیگر تخلیق کے لمحہ گریزاں میں وہ ان کی کثافتوں اور آلودگیوں سے پاک ہو جاتا ہے جو عملی زندگی

میں اسے ملوث رکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے انہیں معلمِ اخلاق کہا ہے۔(۱۳)

رشید صدیقی تاثراتی تنقید کے خوشہ چین ہیں۔اس کی ایک مثال خواجہ حسن نظامی کے بارے میں لکھے ہوئے یہ الفاظ ہیں: ''راقم السطور کو رعایت لفظی یا حروف کے الٹ پھیر سے طبعاً نفرت ہے۔خواجہ حسن نظامی کے ہاں یہ چیز کثرت سے ہے۔''(۱۴) اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ہاں تنقید کی حیثیت مبسوط اور منظّم نہیں ہے۔وہ نہ تو کوئی مفکرانہ بات کرتے ہیں اور نہ ہی کسی تخلیق کا تجزیہ کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کے نزدیک تنقید صرف ان کی رائے کا نام اور ان کی شخصی معیار یا پسند قرار دی جاسکتی ہے۔چونکہ وہ ماحول کی عکاسی کرتے ہیں اور کسی بھی تخلیق یا فن پارہ کے بارے میں جو کچھ کہتے ہیں وہ ایک لحاظ سے درست ہوتا ہے۔دوسرا یہ کہ چونکہ وہ اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہیں اس لیے ان کی تنقید تخلیق کے درجے پر پہنچ جاتی ہے اور یہی ان کا کمال ہے حالانکہ صرف ماحول کی عکاسی خواہ کتنی ہی درست کیوں نہ ہو نقاد کے لیے ضروری نہیں بلکہ ماضی کی روایات کا صحیح شعور حالات کے پیچ وخم کا خارجی نقطہ نظر سے تجزیہ اور مستقبل سے گہری نظر انتقادی فرائض منصبی میں داخل ہے۔ کیوں کہ تاریخی بصیرت رکھنے والا عالم کسی فن پارے کو صرف اپنے عہد کے نقطہ نظر سے جانچ کر مطمئن نہیں ہوتا بلکہ اسے چاہئے کہ فن پارے کا جائزہ ایک تیسرے عہد کے نقطہ نظر سے لے جو نہ اس کا ہو اور نہ مصنف۔فن پارے کی تنقید وتفسیر کی تاریخ کا یوں جائزہ لیا جائے کہ اوروں کے لیے باعثِ رہنمائی ہو۔رشید صدیقی کی تنقید میں یہ فکر، تجزیہ اور رچاؤ نہیں ملتا۔انہیں جو فن پارہ جس طرح محسوس ہوا اُسے اُسی رنگ میں دیکھتے ہیں اور اسی کا نام ان کے ہاں تنقید ہے۔ان کی تنقید میں گہرائی اور گیرائی تلاش کرنا غیر ضروری چیزیں ہیں۔(۱۵)

رشید صاحب فن کار کے لیے کسی تجدید یا اصول کی پابندی کے مخالف ہیں (حالانکہ بعض جگہوں پر انہوں نے اصولوں پر زور دیا ہے۔وہ اپنی تنقیدوں میں نقاد سے زیادہ فن کار نظر آتے ہیں اسی لیے وہ اپنے لیے کسی پابندی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ان کے خیال میں فن کار ہر پابندی سے آزاد ہوتا ہے جبکہ ہر چیز فن کار کی پابند ہے حتیٰ کہ فن کار اپنے ارادوں کا نہیں بلکہ ارادے فن کار کے تابع ہوتے ہیں۔وہ شاعر، ادیب یا ارٹسٹ کو نہ زمانے اور نہ ہی زندگی کے پابند مانتے ہیں بلکہ ان کے خیال میں زمانہ، زندگی اور نقاد تینوں شاعر، ادیب اور آرٹسٹ کے منتظر ہوتے ہیں۔وہ اپنے ارادوں کے پابند نہیں ہوتے بلکہ ارادے کو اپنی ضرورت تسلیم کرواتے ہیں۔اگر شاعر اپنے ماحول کا پابند یا نقاد کی حکم برداری پر مجبور ہو تو شاعری، ادب اور زندگی سے نیا پن جو عین زندگی ہے، جاتی رہے۔

رشید صدیقی کے یہ خیالات اگرچہ بظاہر بے حد خوبصورت ہیں کہ وہ شاعر، ادیب یا آرٹسٹ کے لیے آزادی ہو، اور آزادی اس وقت تک آزادی کہلائی نہیں جاسکتی جب تک کہ وہ پابند نہ ہو۔ہر شاعر، ادیب اور فن کار کے لیے بہر کیف چند اقدار کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔ورنہ جو ادب پیدا ہوگا وہ صالح نہیں کہلایا جاسکے گا۔اگر ان کے مندرجہ بالا خیالات کو تسلیم کیا جائے تو اس کی تردید انہوں نے کئی بار خود بھی کی ہے۔اس کا ثبوت یہ ہے انہوں نے اپنے آپ کو ہر قید وبند سے آزاد کرلیا ہے۔جب وہ ترقی پسندوں کو اسی وجہ سے مذموم قرار دیتے ہیں۔تو پھر شاعر، ادیب اور فن کار کے لیے کیوں کر آزادی کے طالب ہوسکتے ہیں۔اسی وجہ سے انہیں تاثراتی نقطہ نظر کے نقادوں میں گنا جاسکتا ہے۔تاثراتی تنقید وزن ووقار کی بہت کم حامل ہوتی ہے کیوں کہ یہ تنقید کسی اصول یا پابندی سے بے تعلق ہوتی ہے۔

رشید صاحب کا تنقیدی عمل اپنے اندر ایک انفرادیت رکھتا ہے۔ وہ اپنے ذہن میں اپنے موضوع کا دائرۂ عمل طے کر لیتے تھے۔ جس کو پیش نظر رکھتے ہوئے وہ مضمون کا پہلا مسودہ تیار کر لیتے تھے۔ اس عمل کے دوران اور اس کے بعد بھی بہت سے نکات، خیالات اور تبصرے ان کے ذہن میں بازگشت کرتے رہتے تھے۔ جن کو وہ اصل متن میں اس طرح ضم کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ ان کا اصل متن مجروح نہ ہو اور اس کی روانی پر بھی اثر نہ پڑے۔ یہ کام رشید صاحب کے لیے خاصا مشکل ہوتا تھا کیوں کہ گول سوراخ میں چوکور میخ کا بٹھانا ان کے مزاج کی لطافت پر گراں گزرتا تھا۔ وہ ان بازگشتوں کی ''مفردات'' کی طرح ان رقعوں پر تحریر کر لیا کرتے تھے۔ پھر ان کے لیے مناسب و موزوں جگہ تلاش کرنے کی سعی کرتے تھے۔ یہ ریاض رشید صاحب ہی نہیں ہر صاحب قلم کے لیے مشکل ہوتا ہے۔ رشید صاحب ان امتحان میں ہمیشہ پورے اترے۔ ان کی تحریر جب بھی تراش خراش کے آخری مرحلے سے گزر کر اشاعت پذیر ہوتی تو اس میں کوئی منطقی جھول نہیں ہوتا تھا۔ ان کی رائے میں کوئی سقم یا رشید صاحب کی ہی اصطلاح میں ''کوبڑ'' نہیں پایا جاتا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے قلم سے نکلے ہوئے ہر فقرے اور جملے کی ذمہ داری خود محسوس کرتے تھے۔ ان کے بارے میں چند نقادوں کا خیال ہے کہ رشید صاحب زبان غلط لکھتے تھے۔ یہ بات عجیب ہے کیوں کہ وہ اس معاملے میں رشید صاحب خاصے محتاط تھے۔ اتنا ہی نہیں، وہ اس کا بھی اہتمام کرتے تھے کہ تحریر خشک، بے رس، بوجھل اور بے کیف نہ ہو جائے۔ اس کا فائدہ ان کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے پہنچتا تھا۔ اس تفریح سے یہ مراد نہیں ہے کہ ان کی تنقیدی تحریروں پر بھی ان کی طنز و مزاح نگاری غالب رہتی تھی بلکہ توجہ اس امر کی طرف مبذول کرانی ہے کہ وہ تنقید میں بھی شگفتگی کا دامن نہیں چھوڑتے تھے۔

رشید صاحب پیشہ ور نقاد کی حیثیت سے خود کو متعارف کرانا نہیں چاہتے تھے اس لیے انہوں نے نظریہ سازی یا اصولی مضامین لکھنے میں کبھی دلچسپی نہیں لی۔ وہ عموماً ابتدائی و تعارفی سطور میں موضوع کی تاریخی پس منظر کا خلاصہ پیش کیا کرتے تھے۔ صرف ''جدید غزل'' ان کی ایسی واحد کتاب یا تحریر ہے جس کی ابتداء میں انہوں نے تھوڑی بہت اصولی و نظری باتیں بھی لکھی ہیں۔ لیکن انہوں نے کبھی فکری یا فلسفیانہ باتیں نہیں کی ہیں سوائے اس کے کہ انہوں نے اپنے مؤقف کو اپنی ذاتی رائے بنا کر پیش کیا ہے۔ بعض مواقع پر ایسا بھی ہوا ہے کہ انہوں نے کوئی شوخ جملہ یا فقرہ ''جملۂ معترضہ'' کے طور پر لکھ دیا اور وہ ان کی رائے سے منسوب کر دیا گیا۔ یہ دوش ایک نوعیت سے درست بھی تھی کیوں کہ رشید صاحب خود کو آسانی سے گرفت میں نہیں آنے دینا چاہتے تھے۔ وہ سب کچھ کہنے کے باوجود اپنے آپ کو ''بری الذمہ'' رکھنا چاہتے تھے۔ ان ''جملہ ہائے معترضہ'' کو اہمیت کسی غلط فہمی یا کم فہمی کی بنا پر نہیں دی گئی بلکہ رشید صاحب کی اس ژرف نگاہی کی وجہ سے دی گئی جو ان جملوں میں مضمر ہوتی تھی۔ یہ ایک نوعیت سے وہ حاصل مطالعہ ہوتے تھے جو رشید صاحب اپنی ذہانت کی بنا پر ایک جملے میں بہت جامع انداز میں پیش کر دیتے تھے۔ رشید صاحب کے ''جملہ ہائے معترضہ'' نقادوں کے درمیان جس قدر مقبول ہوئے اتنے کسی اور نقاد کے نہ ہو سکے۔ یہ رشید صاحب کا امتیاز بھی ہے اور ان کے قارئین کی طرف سے ان کا اعتراف بھی۔ شاید ان جملوں کی جامعیت ہی کی وجہ سے کلیم الدین احمد انہیں دماغی کاہلی اور طبیعت کی کج روی کا حامل قرار دیتے تھے۔ مگر اگلے ہی لمحے انہیں ان میں ایک کامیاب نقاد کے امکانات بھی نظر آتے تھے۔ کلیم الدین احمد نے ''زخم و مرہم'' تنقید میں رشید صاحب کا قابل توجہ اعتراف کیا ہے۔ رشید صاحب جب ایک فقرے میں بہت بڑی بات کہہ سکتے تھے تو انہوں نے تفسیر تیسیر کا طریقہ کیوں نہ اختیار کیا؟ انہوں

نے وضاحت اور استدلال کے ساتھ اپنی رائے کیوں نہ پیش کی؟ اگر وہ ایسا کرتے تو یقیناً وہ دماغی کاہلی کا مظاہرہ نہ کرتے اور اردو تنقید میں قابلِ قدر اضافہ کرتے، لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اس لیے کلیم الدین احمد نے انہیں سلامت روی سے عاری قرار دیا۔(۱۶)

رشید صاحب نقاد بننا ہی نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنے قلم کی لگا میں کھینچے رکھیں اور خود کو نقاد نہ بننے دیا لیکن ان کے اندر کا وہ صاحبِ بصیرت کبھی بھی گرفت میں نہ آ سکا جو ادب پر بہت ہی اچھی نظر رکھتا تھا۔ اسی لیے وہ کبھی کبھی، ایک جملے ہی میں سہی اپنے وجود کی چغلی کھا جاتا تھا۔

رشید صاحب کے بہت سے ''جملے ہائے معترضہ'' اس حد تک معروف و مقبول ہوئے کہ ضرب المثل بن گئے۔ بہت سے نقادوں نے انہیں جا و بے جا استعمال کرنا شروع کر دیا اور ان سے طرح طرح کے معنی حسب خواہش اخذ کرنے شروع کر دیئے۔ ان بعض بے حد معروف جملوں میں سے چند حسب ذیل ہیں؛

''فن کوئی خارجی چیز نہیں ہے۔ یہ خود صاحب فن کی زندگی اور کارکردگی کا حاصل بھی ہوتا ہے اور جز بھی۔۔۔

''فن کی قدریں اور انسان کی قدریں یکساں ہیں، ایسا کوئی فن نہیں ہے جو انسان سے اونچا یا اس سے علیحدہ ہو۔۔۔

''میں صرف ان فنون لطیفہ کا قائل ہوں جو اقدار عالیہ کے تابع اور ان کے مفسر و منادہوں۔۔۔

''شاعری برائے شاعری اسی طرح فعل عبث ہے جس طرح شاعری برائے مقاصد مشتبہ۔ شاعر، ادیب یا آرٹسٹ نہ زمانے کے پابند ہوتے ہیں، نہ زندگی کے، نہ نقاد کے، زمانہ، زندگی اور نقاد تینوں شاعر، ادیب اور آرٹسٹ کے منتظر ہوتے ہیں، زمانہ ان کا پابند ہوتا ہے، یہ زمانے کے پابند نہیں ہوتے۔۔۔

''ایسی شاعری کس مصرف کی جس سے ہم نہ شاعری کی بڑائی محسوس کریں، نہ شعر کی، نہ شاعر کی، نہ اپنی، نہ بہ حیثیت مجموعی زندگی کی۔۔۔

''شعر، ادب ہو زندگی ہو فن ہو سب لا طائل ہیں اگر حیا کو بالائے طاق رکھ دیا جائے، بے حیائی و بے غیرتی فن نہیں معصیت ہے۔۔۔

''شاعری کو حقیقت اور ''انسانیت'' کا ترجمان ہونا چاہیے نہ کہ وہ کسی زبان، کسی قوم، کسی ملک، کسی زمانہ اور کن روایات کا ترجمان ہے۔۔۔

تنقید کے معاملے میں رشید صاحب جس قدر سخت گیر تھے اتنے وہ دوسری اصناف ادب کے سلسلے میں نہیں تھے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ تنقید کو ایک ذمہ دارانہ ادبی احتساب تصور کرتے تھے۔ وہ تمام رعایات جو وہ دوسری اصناف ادب کے لیے روا رکھتے تھے۔ یہ رعایات وہ تنقید کو دینے کے لیے آمادہ نہیں تھے۔ کیوں کہ؛

''میں ادب میں تخلیقی اپج کو خود روی یا بے گانہ روی کو جتنا سراہ سکتا ہوں تنقید میں اسی قدر اصولوں سے قربت اور مرتب و منظم سنجیدگی اور میانہ روی کا قائل ہوں۔۔۔

''اعلیٰ تنقید ہمیشہ اعلیٰ تخلیق سے برآمد ہوتی ہے اور اعلیٰ تخلیقات کا مدار تمام تر اس پر ہے کہ تخلیق کرنے والا کائنات کی عظمت اور فن و زندگی کی اعلیٰ قدروں کا حامل ہے یا نہیں۔۔۔

''تنقید نہ یزداں کا فن ہے نہ اہرمن کا، وہ انسان کا فن ہے اور انسان کے ادبی کارناموں کے پرکھنے کا فن۔۔۔
''تنقید کا غلبہ ہوتا ہے تو شاعری اور تخلیقی کارنامے ماند پڑنے لگتے ہیں''۔

لیکن ان اصولوں و مطالبات کی طرف عدم توجہی کی وجہ سے جس انتشار نے فروغ پایا وہ رشید صاحب کے نزدیک غلط تھا۔ ان کے خیال میں ادب کو صالح فریضہ انجام دینا چاہیے۔ اس سے خیر فروغ پائے نہ کہ تخریب و تاراجی؛

''اردو میں تنقید کا مسئلہ کچھ دنوں سے محض ادبی یا علمی نہیں بلکہ معاشی اس سے آگے بڑھ کر سیاسی اور بالآخر نفسیاتی بن گیا ہے''۔
(تنقید) اپنے کو نمایاں اور دوسرے کو رسوا کرنے کا بڑا سستا لیکن ناواجب طریقۂ عمل ہے''۔

ان چند ایک اقتباسات سے رشید صاحب کا یہ زاویۂ نظر بھی ابھرتا ہے کہ وہ ادب کو ان حدود سے تجاوز نہیں کرنے دینا چاہتے۔ وہ فن کو گندگی اور فن کار کو ''دھوبی کا گدھا'' بنتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتے۔ اس عجیب سی مثال کو بھی انہوں نے ارتفاع عطا کر دیا ہے؛

''حال کے شعراء کا رنگ کچھ اور ہے انہوں نے سوسائٹی کے میلے گندے کپڑے شارع عام پر دھونے پچھاڑنے کا فن ایجاد کیا ہے۔۔۔ شاعری میں دھوبی کا کاروبار برا نہیں لیکن دھوبی اور دھوبی کے گدھے میں تو فرق کرنا ہی پڑے گا۔۔۔

اس رویہ کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ رشید صاحب کا ذہن اپنی ایک خاص اقدار رکھتا تھا جو ان ابدی اقدار کا احترام کرتا تھا اور ان کی استواری کے لیے برابر کوشاں رہتا تھا۔ اس کی تصدیق ان کے مندرجہ ذیل اقتباس سے ہوتی ہے؛

میں مذہب و اخلاق کو افکار و عمل میں وہی درجہ دیتا ہوں جو کلاسکس کو شعر و ادب میں۔(۱۷)

اس اعلان کی تفسیر رشید صاحب کی آخری دور کی تحریریں ہیں۔ جن میں اس مسلسل طویل مضمون کو خصوصی اہمیت حاصل ہے جو ''فکر و نظر'' میں ''علی گڑھ ماضی و حال'' کے عنوان سے خاصے عرصے تک شائع ہوتا رہا جس میں انہوں نے انسان کو اعلیٰ ترین پیکر میں دیکھنے کی کوشش کی۔ اس دور میں وہ جس ذہنی ساخت کے حامل ہو چکے تھے وہ ان کے چند طویل خطبات میں بھی منعکس ہو رہی تھی۔ خواہ وہ ''عزیزان ندوہ کے نام'' ہو، ''عزیزان علی گڑھ کے نام'' ہو، ''علی گڑھ کی مسجد قرطبہ'' ہو، ''اقبال کی شاعری'' ہو، ''چند یادیں'' ہو یا ''سلام ہو نجد پر'' ہر موضوع میں ان کی بنیادی فکر زیرین رو کی طرح جاری و ساری رہتی تھی۔

رشید صاحب اگرچہ باقاعدہ تنقید نگار نہیں پھر بھی انہیں نقاد کی حیثیت سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اردو میں وہ اپنی طرز کے واحد نقاد ہیں۔ ان کا طرزِ تنقید نہ مشرق سے مستعار ہے نہ مغرب سے مغلوب۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ اپنے اسلوبِ نقد کے پیش رو بھی ہیں اور جانشین بھی۔ ایک جگہ لکھتے ہیں؛

> میں کسی ایسی تنقید کا قائل نہیں ہوں جس کے سانچے ڈھلے ڈھلائے پہلے سے موجود ہوں۔ بنے بنائے اصول باہر سے کمیشن پر منگوانا اور کام نکل جانے پر کارخانہ کو واپس کر دینا تنقید نہیں نالائقی ہے۔ شاعری کا کوئی کارخانہ نہیں ہوتا جہاں فرمائش کی چیزیں بالکل نپی تلی ایک ہی طرح کی بے شمار تعداد میں نکلتی ہوں۔ شاعری مشینی عمل نہیں ہے۔ شخصی کردار ہے جس کو سمجھنے اور سمجھانے کیلئے تنقید کے اصول اتنے ضروری نہیں ہوتے جتنا خود شاعر کو سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔(۱۸)

یہ عبارت رشید صاحب کے نظریۂ تنقید کی ترجمان ہے اور ان کے تنقیدی مضامین اس نظریہ پر ان کے عمل کی نمائندگی کرتے

ہیں۔رشید صاحب تنقید وتبصرے میں دوسروں کا سہارا لینے یا حوالہ دینے کے قائل نہیں۔ یہ بات بہت کم نقادوں میں پائی جاتی ہے۔اس سے زیادہ اہم چیز جو رشید صاحب کو دوسرے تمام نقادوں سے الگ کرتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ان کے تنقیدی مضامین معلومات افزا ہونے سے زیادہ بصیرت افروز ہوتے ہیں۔ وہ کسی ادیب یا شاعر کے متعلق یہ نہیں بتاتے کہ وہ کن حالات میں پیدا ہوا اور کن مجبوریوں کے ماتحت جاں بحق ہو گیا۔ یا کوئی ادبی تحریک کس انقلاب کی پیداوار تھی اور کن حادثات کا شکار ہو کر رہ گئی۔ان کے مضامین ،ادیبوں ،شاعروں ،تحریکوں اور نظریوں کے متعلق رموز ونکات کی مالا ہوا کرتے ہیں جن میں زندگی، زمانہ،تہذیب ،تمدن اور اسی قبیل کی دوسری چیزوں کے بارے میں ان کے اچھوتے اور انوکھے خیالات کے موتی جگمگا رہے ہوتے ہیں۔بعض ادیبوں اور شاعروں کے متعلق اگر کسی نقاد کی رائیں لائق اعتماد نہیں ہیں تو نہ سہی دیکھنا یہ چاہیے کہ مجموعی طور پر وہ شعروادب اور زندگی کے متعلق ہماری بصیرت میں کس حد تک اضافہ کرتا ہے۔اس لحاظ سے رشید صاحب کا رتبہ بہت بلند تر نظر آتا ہے۔انہوں نے بہت سے ادبی اور فکری مسائل پر اظہار خیال کیا ہے اور بڑے پتے کی باتیں کہی ہیں۔سرور صاحب نے لکھا ہے کہ رشید صاحب کو نئے خیالات سے خدا واسطے کا بیر تو نہیں مگر وہ اس نئے پن کو پوری طرح ہضم نہیں کر پاتے۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے لیکن رشید صاحب جس طرح اپنے حافظہ کی کمزوری کے باوجود برمحل شعر کا حوالہ دینے میں خاص کمال رکھتے ہیں اسی طرح نئے خیالات کے علم برداروں اور نئے ادب کے پرستاروں سے جو باتیں کہی ہیں وہ بڑی حد تک معقول بھی ہیں اور مفید بھی۔ رشید صاحب ادب اور زندگی کے رشتہ کے قابل ہیں اور ادیب وادب پر عوام کے حقوق کو بھی تسلیم کرتے ہیں مگر وہ یہ پسند نہیں کرتے کہ ادب ہندوستان کا اور زندگی ماسکو کی، یا ادب میں ادیب کے سوا ہر کس وناکس کی جلوہ گری پائی جائے۔ یہ ہر کس وناکس کو شعروادب کے جواہر پاروں سے دے دیا جائے۔ان کے اس خیال میں کس قدر صداقت ہے اور وزن بھی؛

> اچھا اور بڑا شاعر کسی مخصوص طبقہ کا شاعر نہیں ہوتا وہ ہر طبقہ اور ہر عہد کا شاعر ہوتا ہے۔''اشتراکی نظام'' کا اچھا اور بڑا شاعر اتنا ہی قابل قدر اور قابل فخر ہوگا جتنا کسی اور نظام کا اچھا اور بڑا شاعر خواہ وہ نظام آج سے ہزاروں سال پہلے تھا یا ہزاروں برس بعد آئے۔(۱۹)

اسی طرح ان کا یہ خیال بھی صحت وصداقت سے دور نہیں کہ ''آرٹ ہو یا ادب اس کا کاروبار قطعاً ذاتی اور انفرادی ہوتی ہے''اس خیال سے تو میراجی کے ہم مشربوں کو مسرور ہونا چاہیے اور نہ سردار جعفری اور ان کے ہم قافلوں کو مایوس۔ کیونکہ رشید صاحب کے نزدیک شعروادب میں نہ تو انفرادیت کے معنی اس دھندلکے میں اسیر رہنے کے ہیں۔جس میں میراجی اور ان کے ہم مشرب اسیر ہیں اور نہ اجتماعیت ومعنی اس تہلکے اور تبلیغ کے ہیں۔جس میں سردار جعفری اور ان کے رفقائے راہ مصروف ومبتلا ہیں۔وہ شعروادب میں انفرادیت اور اجتماعیت کو متوازی اور متوازن رکھنے کے قابل ہیں۔اور اس اصول کی افادیت سے کون انکار سکتا ہے۔اگر رشید صاحب نے ایک طرف اس کا مطالبہ کیا ہے کہ؛

> ''شاعری کی ڈفلی بھی اپنی ہو اور راگ بھی اپنا''

تو دوسری طرف انہوں نے یہ بھی کہہ دیا کہ؛

> میں ادب، آرٹ اور زندگی سب کو علیحدہ علیحدہ اور بہ حیثیت مجموعی بھی صرف سلیقہ، شرافت اور سرفروشی سمجھتا

ہوں۔۔۔

ادب انسانیت سے خارج نہیں ہے اور انسانیت کا کوئی ایسا مفہوم نہیں ہے جس کو آپ کچھ اور سمجھتے ہوں ہم کچھ اور۔ انسانیت کو انسانیت ہی کہتے بھی ہیں اور سمجھتے بھی ہیں۔۔۔

ذہنی دنیا میں رہنا یا داخلی شاعر کی آڑ پکڑنا میرے نزدیک یکسر مہمل ہے اور اگر شاعر اپنے آپ کو خارج سے بے نیاز کر لے اور خارج کو توڑنے مروڑنے اور سلجھانے سنوارنے میں خون پسینہ ایک نہ کر دے یا نہ کر سکے(۲۰)

ان اقتباسات سے ظاہر ہے کہ رشید صاحب شعر و ادب میں انفرادیت اور اجتماعیت کا ایسا امتزاج دیکھنا چاہتے ہیں جس کے بغیر کسی کا شعر و ادب نہ مفرد بن سکتا ہے نہ مفید۔

رشید صاحب الفاظ و اسلوب کے عمدہ پارکھ، روایات اور رجحانات کے بالغ نظر نقاد اور شعر و ادب کے بڑے اچھے مزاج دان ہیں۔ ان کی تنقیدی تحریریں اردو ادب کے تنقیدی سرمایہ میں قابل قدر اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ سرور صاحب نے ان کی تنقید نگاری کے متعلق کہا ہے؛

تنقید میں اگر چہ انہوں نے کبھی کبھار کسی اچھی چیز کی تعریف نہ کی لیکن آج تک میں نے ان کی کوئی ایسی تنقید نہ دیکھی جس میں کسی پست اور ناقص کارنامے کو انہوں نے سراہا ہو۔(۲۱)

رشید صدیقی کا بطور نقاد کوئی واضح مقام ہو یا نہ ہو لیکن اپنی ذکاوتِ طبع کی وجہ سے کسی فن پارے کے بارے میں ان کی رائے چونکا دینے والی ہوتی ہے اور ان کی انفرادیت کا غماز بھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کے انہوں نے شعر و ادب کا طرح داری اور سرشاری سے جائزہ لے کر اپنی ایک نئی روایت قائم کر لی ہے۔ اپنے اسلوب اور لب و لہجہ کی کھنک کی وجہ سے ان کی اردو تنقید حیات آفرین اقدار کی حامل ہے اور بہترین اسلوب کا نمونہ بھی۔ کیوں کہ ان کی رائے ماہرانہ ہوتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ انور صدیقی ،''رشید صاحب کی تنقید نگاری''مشمولہ سہ ماہی ''نقد ونظر (رشید احمد صدیقی نمبر)''علی گڑھ ،علی گڑھ مسلم یونیورسٹی،علی گڑھ، جون ۱۹۸۰ء،ص ۳۷

۲۔ رشید احمد صدیقی،''مقدمہ باقیاتِ فانی''،آگرہ اخبار،آگرہ،س ن،ص ۲۶۔۲۷

۳۔ اسلوب احمد انصاری،''اطرافِ رشید احمد صدیقی''،انجمن ترقی اردو،کراچی،باراوّل،۱۹۹۵ء،ص ۱۳۱۔

۴۔ سجاد ظہیر،''روشنائی''بحوالہ''رشید احمد صدیقی ،فن اور شخصیت''از سلیمان اطہر جاوید،نیشنل بک ڈپو، حیدرآباد ،باردوم ۱۹۷۶ء،ص ۲۸۱

۵۔ رشید احمد صدیقی،''خطبات''،مرتبہ لطیف الزمان،مہر الٰہی ندیم،مکتبہ دانیال کراچی،۱۹۹۱ء،ص ۲۹۰

۶۔ اسلوب احمد انصاری،کتاب مذکور۔ص ۱۳۳

۷۔ رشید احمد صدیقی،خطبات۔ص ۳۲۱

۸۔ رشید احمد صدیقی''جدید غزل''،مرتبہ ڈاکٹر سیّد معین الرحمان،الوقار پبلشرز،لاہور،۱۹۸۷ء،ص ۳۳

۹۔ رشید احمد صدیقی''مقدمہ باقیاتِ فانی''کتاب مذکور،ص ۲۰

۱۰۔ اصغر عباس،''رشید احمد صدیقی،آثار واقدار''،شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ،۱۹۸۴ء،ص ۲۶۹

۱۱۔ اسلوب احمد انصاری ،''رشید احمد صدیقی نقاد اور نثر نگار''مشمولہ رشید احمد صدیقی (کردار افکار گفتار)''، از مالک رام ، خیام پبلشرز،لاہور،باراوّل ۱۹۸۳ء،ص ۱۴۵

۱۲۔ رشید احمد صدیقی،''غزل غالب اور حسرت''،مرتبہ ڈاکٹر سیّد معین الرحمان،الوقار پبلشرز،لاہور،۱۹۹۵ء،ص ۲۰

۱۳۔ ایضاً،ص ۳۷۔۳۸

۱۴۔ وزیر آغا،ڈاکٹر،''رشید احمد صدیقی،ایک معلم اخلاق''مشمولہ ماہنامہ''اوراق''لاہور،جون ۱۹۶۶ء،ص ۹۷

۱۵۔ رشید احمد صدیقی،''طنزیات ومضحکات''،آئینہ ادب لاہور،۱۹۶۶ء،ص ۶۷

۱۶۔ سلیمان اطہر جاوید،''رشید احمد صدیقی فن اور شخصیت''،نیشنل بک ہاؤس حیدرآباد،باردوم جون ۱۹۷۶ء،ص ۲۹۰

۱۷۔ رشید احمد صدیقی،''غالب نکتہ داں''،مرتبہ لطیف الزمان،مہر الٰہی ندیم۔مکتبہ دانیال کراچی،جنوری ۱۹۹۷ء،ص ۱۷۔۱۸

۱۸۔ کلیم الدین احمد،''اردو تنقید پر ایک نظر''۔وآئینہ ادب لاہور۔۱۹۸۷ء۔ص ۴۵۔

۱۹۔ ابنِ فرید،''رشید صاحب کی تنقیدی بصیرت''،مشمولہ''رشید احمد صدیقی،شخصیت اور ادبی قدر وقیمت''، از پروفیسر ابوالکلام قاسمی،اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ۔۱۹۹۸ء۔ص ۱۸۱۔۱۸۲

۲۰۔ رشید احمد صدیقی''شیرازہ خیال''مرتبہ نظیر صدیقی،کاروان ادب ملتان۔باراوّل ۱۹۷۷ء۔۱۳۰

۲۱۔ نظیر صدیقی،''رشید احمد صدیقی''،مشمولہ''رشید احمد صدیقی،شخصیت اور ادبی قدر وقیمت''۔ص ۲۱۵